مقدس یروشلم کے استحقاق ملکیت کے حوالے سے سامی مذاہب کے دعویٰ جات کا علمی جائزہ

A Review of the Semitic Religions' Claims for the Property of Holy Jerusalem

ڈاکٹر ضیاء اللہ خان جدون•
ڈاکٹر عبد المنان••

Abstract:

Today, the Semitic religions of Judaism, Christianity and Islam are at loggerheads with each other over the issue of Jerusalem, and each side has put forward its own claims and arguments. Not only Arabs and Golf countries, but peace of the whole world is connected with this issue. Today, it is spread everywhere and people are talking about it. The Jewish are nowadays capture it. They argue that it is their religious and legal right on this Holy land. On the other hand, Christians claim that it is their religious and legal right on this Holy land. They also claim that Jesus was born there, He was stabbed here and he will be crucified here, and at the end of time He will come and establish a kingdom for a thousand years, so this is their right on it. They say that this is the issue of peace about Jerusalem and the peace only occurred in the time of Muslims. There has been a lot of talk among the Jews and Christians about the violation of the honor and dignity of this Holy city.

Keywords: Jerusalem, Jews, Christianity, Islam, Ownership

• اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اسلامیات جامعہ صوابی، صوابی
•• اسسٹنٹ پروفیسر اسلامیات، اباسین یونیورسٹی پشاور

تعارف

یروشلم کا قضیہ اس وقت سہ فریقی مسئلہ بن چکا ہے یہ مقدس شہر اپنے سینے میں یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی دینیاتی اور سیاسی تاریخ سموئے ہوئے ہے۔ جو ماضی میں یہاں پر اپنی دینی اور سیاسی قوت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد یروشلم سے بنی اسرائیل کی بے دخلی اور پھر واپسی اور یہودی مہاجرت مقدس یروشلم میں مسیحیت کا دینیاتی اور سیاسی دباؤ کا سبب بنی جو ساتویں صدی عیسویں تک قائم رہی۔ ساتویں صدی عیسوی میں یہاں سے مسیحیت کی بے دخلی سے اسلام کا سیاسی اور دینیاتی دبدبہ قائم ہوا جو صلیبی جنگوں سے اختتام پذیر ہوا۔ بیسویں صدی عیسوی کے نصف اول کے بعد یروشلم میں اسرائیل کی آمد اور گردونواح کے حالات یقیناً تینوں مذاہب کے درمیان تناؤ کے لیے مواد فراہم کرتے ہیں۔ مقدس یروشلم میں آخری سیاسی قوت کا مظاہرہ اور عالمگیر خلافت کے قیام کے بارے تینوں مذاہب کی جداگانہ تاریخ ہے جس کے پیچھے دینیاتی، سیاسی اور نسلی عوامل کارفرما ہیں۔ زیر نظر موضوع کا انتخاب اسی باب کے پیش نظر کیا گیا ہے جس میں تینوں مذاہب کے مؤقف کو ان کے دینیاتی نصوص اور مذہبی روایات کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جائے گا۔ قطع نظر اس سے کہ اس دینیاتی ادب کا استنادی معیار کیا ہے اور ادب کب اور کیسے تحریفی اور تصحیفی عمل سے دوچار رہا ہے؟

یہودی مؤقف

اس ضمن میں "یہودیت" کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ مقدس شہر ان کے آباءواجداد نے آباد کیا جو ان کا واحد مرکزی مقام ہے جس سے ان کی مذہبی وابستگی بھی پائی جاتی ہے اس لیے یہاں حکومت کا قیام ان کا ہے اس لیے وہ اس باب میں عیسائیوں کے خلافت کے قیام کے دعوے کو متعدد وجوہ سے بے بنیاد سمجھتے ہیں۔ **اوّلاً** اس لیے کہ مسیحیت یہودیت کی شاخ ہے جسے مسیحی برادری بھی تسلیم کرتی ہے۔ **دوم** اس لیے کہ آنے والا منجی حضرت مسیح کی طرح حلیم اور بردبار انسان نہیں ہوگا بلکہ ایک قوی اور مضبوط مسیح ہوگا۔ یعنی وہ حضرت عیسیٰؑ نہیں ہوں گے جس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ یہودیوں نے اس وقت بھی حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی تھی اور وہ اب بھی صرف اپنے ہی دین کو بالاتر اور راہِ نجات تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ مسیحیت کو قریب قریب یہ یقین دہانی کرانے میں کامیاب ہو چکے ہیں کہ یہودیت کی برتری میں ہی مسیحیت کی بھلائی ہے، تبھی تو انہوں نے ان کا ہاتھ تھاما ہے اور یہی وجہ تھی کہ آج سے ایک صدی پیشتر جب یہ مقدس شہر مسیحیوں نے مسلمانوں سے لیا، تو یہودیوں نے انہیں اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ یہی وہ مقام ہے جس کی کتاب

مقدّس میں بشارت دی گئی ہے کہ آخر وقت میں خدا اسے بنی اسرائیل (یہودیوں) کو واپس دلائے گا[1]۔ اس لیے یہودی یروشلم پر قبضے کو ایسی ریاست کے قیام کے لیے ضروری سمجھے ہیں جہاں اپنے نجات دہندہ مسیحا موعود کا انتظار کر سکیں جو ان کو مصائب اور کفر و شرک سے نکال کر دنیا پر اسرائیلی حکومت کریں گے جس سے ان کے سنہرے دن واپس لوٹ آئیں گے۔ اوراس علاقے پر مسلمانوں کی اجارہ داری کا دعویٰ دو وجہوں سے درست نہیں۔ **پہلی** وجہ منقولی ہے کہ قرآن مجید اور کتاب مقدّس دونوں میں بنی اسرائیل کی واپسی کا ذکر موجود ہے[2]۔ کتاب مقدس کے حکم کو مسلمان تحریف کی وجہ سے نہیں مانتے جس کا ذکر قرآن کریم میں ان الفاظ میں پایا جاتا ہے: ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ثَمَنًا قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ[3]﴾ اور بائیبل مقدس کا نہ تو کلیتاً انکار کرتے ہیں کرتے ہیں اور نہ ہی اقرار۔ لیکن اپنی آسمانی کتاب قرآن مجید کے حکم پر بھی یقین نہیں رکھتے جس میں واضح الفاظ میں اس علاقے میں یہودیوں کی سکونت کا ذکر پایا جاتا ہے:

﴿وَقُلْنَا مِنْ بَعْدِهِ لِبَنِي إِسْرَائِيلَ اسْكُنُوا الْأَرْضَ فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيفًا[4]﴾

ترجمہ: اور کہا ہم نے بنی اسرائیل کو کہ زمین میں جہاں چاہو رہو، ہاں جب آخری وقت آئے گا تو میں (خدا) تم سب (بنی اسرائیل) کو جمع کر کے (اس ارض مقدسہ میں) لاؤں گا۔ ﴿فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ الْآخِرَةِ لِيَسُوءُوا وُجُوهَكُمْ﴾[5]

دوسری وجہ معقولی ہے کہ حرمین شریفین کے دعویدار مسلمان ہیں جہاں پر اپنے نبی کے اس فرمان "اخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب"[6] پر عمل پیرا ہونے کی خاطر یہودیوں کی آبادکاریوں کی آبادکاریوں کی مخالفت کی جاتی ہے جس جگہ کو ان کے آباءواجداد نے آباد کیا اور ہزاروں سال سکونت اختیار کی جسے مسلمان بھی تسلیم کرتے ہیں اس کے باوجود یہودیوں کو یہاں پر قیام کی اجازت نہ دینا کیا انصاف اور عقل کے موافق ہے؟ کہ اپنے مقدس مقامات (حرمین شریفین) سے بھی یہودیوں کو روکا جائے اور یروشلم میں بھی ان کو نہ ٹکنے دیا جائے؟ اس لیے یہودیوں کو خدائی وعدہ پورا کرنے اور آنے والے منجی (مسیح) کے لیے انتظام کرنے کے الگ ریاست قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا بیسویں صدی عیسوی کے اوائل سے یہودیوں کا دنیا بھر سے یروشلم آنا اور پھر 1948ء میں ریاست اسرائیل کا قیام اسی عظیم مشن کا حصہ ہے۔ یاد رہے کہ جہاں تک یہودیوں کے اس دعویٰ کا تعلق ہے تو ان کی یہ واپسی ہو چکی ہے جیسا کہ معروف سکالر ڈاکٹر ڈیوی بیگل کہتے ہیں؛

"...The prophesied return of the nation of Israel to Palestine was fulfilled by the biblical return from Babylon and has nothing to do with twentieth century Israel[7].

ان کی واپسی اس وقت ہو چکی تھی جب یہ بابل سے اسیری کے بعد آئے تھے اور یہی اس خدائی وعدے کی تکمیل تھی یہ ہر گز نہیں کہ یہ بیسویں صدی عیسوی میں یروشلم جا کر اپنا حق جتائیں۔

بلاشبہ سورۃ مائدہ میں حضرت موسیٰ کی زبانی یہ خطہ بنی اسرائیل کے نام کیا گیا ہے[8]۔ جب کہ سورۃ بقرہ میں حضرت اسماعیلؑ کو حضرت یعقوبؑ کا باپ قرار دیا گیا ہے[9]، درآنحالانکہ وہ ان کے چچا تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حضرت یعقوبؑ مرض الموت میں اپنے بیٹوں کو وصیت کر رہے تھے۔ اس آیت میں علی الترتیب حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کو حضرت یعقوبؑ کے آباء واجداد (Forefathers) کے طور پر ذکر کیا گیا ہے[10]۔ لہٰذا حضرت موسیٰؑ کے اس بیان "كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ"[11] میں اولاد اسماعیلؑ اور اسحاقؑ دونوں کا شامل ہونا مذہبی حقیقت ہے۔ خصوصاً اس حوالے سے جب بائبل کی روایات پہلے سے ارض مقدسہ سے متعلق حضرت ابراہیمؑ کی نسل عام کا ذکر کرتی ہیں۔ پھر قرآن کریم بائبل کے مقابلے میں استحقاق ارضی کو نسلی اساس کی بجائے دینیاتی اساس پر استوار رکھتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ مدعی اولاد اسماعیل سے ہو یا اسحاقؑ سے یا اس کا تعلق کسی بھی غیر سامی قوم سے ہو۔ اسی بات کو زبور میں بیان کیا گیا ہے کہ وراثت ارضی کے آخری وارث نیک بندے ہوں گے[12]۔ قرآن کریم کی رو سے حضرت ابراہیمؑ پدرِ اقوام کے ساتھ ساتھ دینی امام اور اس خطہ میں انسانوں کی دینی تاریخ کے مؤسس بھی ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے امامت و وراثت ابراہیمی نسلی نہیں بلکہ دینی قضیہ ہے اور اگر اس حوالے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ کوئی عہد کیا بھی گیا ہو تو اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ اس سے اولاد ابراہیم کا ہر شخص چاہے اہل ہو یا نااہل مستفید ہو گا بلکہ اس کا مصداق صرف اہل افراد ہی ہوں گے جیسا کہ خدائی فرمان: لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ[13] سے مترشح ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ قرآن مجید نے جابجا قوم یہود کو ان کے غیر شرعی افعال کے ارتکاب مثلاً گوسالہ کی عبادت[14]، یوم سبت کی بے حرمتی[15]، شہر میں دخول کے وقت مقدس کلمات کی تبدیلی[16]، مائدہ کے نزول پر ناشکری[17]، اللہ تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت،[18] اور حلال اشیاء کو حرام ٹھہرانے[19] کی وجہ سے ان کو ظالم ٹھہرایا گیا، تو کبھی انہیں انبیاء کی زبانی ملعون قرار دیا گیا[20]، ان پر ذلت، مسکنت اور غضب مسلط کیا گیا[21]، ان کے مفسدانہ رویوں کی پاداش میں انہیں مختلف قوموں کے ہاتھوں تباہ کیا گیا[22] ان کی زیادتیوں کی نشاندہی اس بات

کی غماز ہے کہ جدید یہودی "عہد ابراہیمی" کے وارث نہیں بن سکتے۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق یہودیت ونصرانیت بعد کی پیداوار ہیں۔ جب کہ حضرت ابراہیمؑ تو دین حنیف کے تابع تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:"مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا"[23] اور ان کی اولاد میں سے بھی کسی کسی کا یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہیں تھا[24]۔ وہ سب بھی دین ابراہیمی کے متبع تھے جو باعث نجات تھا اور ہے[25]۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے حوالے سے یہودی اور مسیحی دعوں کا بڑی شدومد سے رد کیا ہے[26]۔ قرآنی آیت سے یہ مفہوم اخذ ہوتا ہے کہ "ابراہیمیت" نسلی نہیں بلکہ دینی اساس ہے۔ اس لیے خداوندی عہد کی اساس بھی دین پر ہی قائم ہوگی کیونکہ وہ صرف سامی نسل کے پیشوا نہیں بلکہ پوری دنیا کے پیشوا گردانے گئے ہیں۔ یروشلم پر یہودی استحقاق اور عالمگیر اسرائیلی خلافت کے انعقاد کے حق کے حوالے سے اس بات کی تصریح ضروری ہے کہا اس خطہ میں اسلام ایسے وقت میں داخل ہوا، جب یہودیت کی مکابی، زیالوطی اور دیگر متعصب انقلابی تحریکیں دم توڑ چکی تھیں اور یہودی اس شہر کے اندر اور باہر سراسیمگی سے دوچار کانپتے، لرزتے اقلیت کی حیثیت سے مسیحی تحکم تلے مجبوری کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اجتماعی سبت کی ادائیگی اور ترانہ "شمہ اسرائیل" کو بلند آواز سے کہنا تو درکنار، اپنے عبادت گاہوں کے کھنڈرات مسیحی گھروں کے کوڑا کرکٹ سے پاک کرنے کی بھی جرأت نہیں کرسکتے تھے۔ وہ تو اس معاہدہ کے ذیلی اور ضمنی فریق بھی نہیں رہے جس کے تحت مسیحی "اسقف" مقدس شہر کو اسلامی خلافت کے سپرد کر رہا تھا۔ دوران معاہدہ تو بس صرف اتنا ذکر ہوا کہ محکوم یہودی مقدس شہر میں سکونت اختیار کرسکتے ہیں۔ لیکن صلیبی جنگوں میں یہودی کسی بھی مرحلہ پر عسکری یا سیاسی فریق نہیں رہے کیونکہ وہ مقدس شہر کو کھو چکے تھے۔ ماضی قریب یعنی بیسویں صدی عیسوی میں یہودی اس علاقے میں فاتحانہ نہیں بلکہ سازشوں سے داخل ہوئے ہیں۔ اس وقت بھی وہ عثمانی خلیفہ کے ماتحت اقلیت کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ انہیں مقدس معابد میں جانے کی ایسی اجازت حاصل تھی جس طرح کہ آج کل سکھ یاتریوں کو حاصل ہے۔ 1948ء تک یورپی استعمار نے یہودیوں کو دھیرے دھیرے مقدس شہر میں جمع کرنا شروع کیا جب اس خطہ میں یہودیوں کے بال وپر نکل آئے تو انہیں نووارد یہودی کے بجائے "قابض یہودی" قرار دیا گیا۔ خود یورپ کے مسیحیوں نے افریقہ اور ایشیاء میں قبضہ جمانے کے لیے اسی طریقہ واردات کو اختیار کیا جہاں وہ "تاجر" کے بجائے "قابض" کہلانے لگے۔ برطانوی، فرانسیسی، پرتگالی، ولندیزی، مسلح افواج کے ذریعہ افریقہ اور ایشیاء کا محاصرہ نہیں کرچکے تھے۔ خلافتِ اسرائیل کے لیے بائبل سے فراہم کئے گئے حوالہ جات تحقیقی زاویہ نگاہ سے ایک کمزور دینیاتی پہلو

رکھتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے گھر (یروشلم) میں یہودی اجتماع[27]، یروشلم میں پرامن بادشاہت کا قیام[28] اور جلاوطنوں کی واپسی[29] حضرت یسعیاہ بن آموص نبی کی کتاب یسعیاہ کی اس وقت کی وہ پیشگوئیاں ہیں کہ جب بخت نصر مقدس شہر پر حملہ کرنے والا تھا۔ باب 1 تا 39 تک حضرت یسعیاہ بخت نصر کے حملہ تک اور بعد ازاں اس کے نتائج تک بتاتے ہیں۔ اور بنی اسرائیل گھوڑوں، خچروں اور پالکیوں پر سوار ہو کر مقدس شہر واپس آ گئے[30]۔ خود ڈاکٹر بیگل اور دیگر مغربی مفکرین نے یسعیاہ کی مذکورہ پیش گوئی کو "اسیری بابل سے واپسی" سے تعبیر کیا ہے کہ ان کا یہ دعوی کہ اللہ نے ان کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ ان کو یروشلم واپس بھیجے گا یہ اس وقت پورا ہوا جب بابل سے یہ لوگ یروشلم واپس ہوئے[31]۔ اس لیے یہودیوں کا یہ موقف وزنی نہیں ہے کہ اس مقدس شہر پر ان کا حق حتمی ہے کہ ان کے ساتھ خدا نے واپسی کا وعدہ کیا ہے جو ہو کے رہے گا نہیں بلکہ کب کا پورا ہو چکا ہے۔

مسیحی موقف

اسی طرح مسیحی بھی یروشلم کے دعویدار ہیں ان کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ یروشلم میں پیدا ہوئے پلے بڑھے، دعوت دی اور بزعم خویش یہیں پر انہیں سزا دی گئی (جس کی نفی قرآن کریم میں: وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ سے کی گئی ہے) یہیں آ کر ان کو نجات دلائیں گے، ساری دنیا پر حکومت کریں گے اور غیر مسیحیوں کا خاتمہ کریں گے۔ اور عقیدہ تثلیث، حلول اور صلیب کی تصدیق کریں گے اور یہودی جس مسیحا کے انتظار میں ہیں اس سے مراد "عیسیٰؑ" ہی ہیں جس کے مسلمان بھی قائل ہیں۔ اور مسلمان تو اس بات کے بھی قائل ہیں کہ آخر وقت میں یروشلم میں ایک عالمگیر حکومت قائم کرنے والے منجی حضرت عیسیٰ ہی ہوں گے جو پوری دنیا پر بادشاہت کریں گے۔ ایسے میں یروشلم کا استحقاق صرف انہی کا مذہبی اور قانونی حق ہے تاکہ وہ آنے والے مسیح موعود کی راہ ہموار کریں۔ ماضی میں صلیبی جنگوں کا تسلسل بھی اسی مشن کا حصہ تھا حالانکہ مسیحیت میں عسکریت کی گنجائش نہیں لیکن پھر بھی پوپ دوم نے یروشلم کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جانے کا فتویٰ صادر کر کے مسیحیت کو اس پر اکسایا۔

اسلامی مؤقف

اسی طرح مسلمانوں کو بھی اس بات کا یقین ہے کہ بیت المقدس کی قسمت میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ آخر وقت میں دین اسلام کی حقانیت کی تصدیق اور یہودیت و مسیحیت کے دعوؤں کی تکذیب کرے گا۔ منجی مسیح خود آ کر ان پر یہ ظاہر کر دے گا کہ کون حق پر قائم ہے اور کون باطل پر اَٹا ہوا ہے۔ اس روزان ابراہیمی ملت پر

کاربند ہونے والا روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گا۔ اس مقدس شہر کی ملکیت اور اپنے دین کی حقانیت کے یہ تینوں دعویدار ادیان، ابراہیمی مذاہب سے متعلق ہیں ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ایک ہی سچا ہو سکتا ہے۔ جو دین اسلام ہے جس کی کتاب قرآن کریم میں غلطی نکالنے کی ہزارہا کوششوں کے باوجود تاحال کوئی کامیاب نہیں ہو سکا ۔ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ جس طرح یہ تینوں سامی مذاہب یروشلم پر اپنا حق جتاتے ہیں اسی طرح ان تینوں ادیان کی مرکزی شخصیت حضرت ابراہیمؑ ہیں جو بنو اسماعیل اور بنو اسحاق دونوں کے والد ہیں جن کے بارے میں قرآنی تعلیمات یہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی اور عیسائی نہ تھے بلکہ وہ پکے مؤحد اور مسلمان تھے۔ فرمان باری تعالیٰ ہے :مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ[32]

"(حضرت) ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی ، بلکہ وہ سب (مشرکوں) سے بیزار ہو کر ایک خدا کے ماننے والے مسلم تھے اور وہ مشرک بھی نہ تھے (بلکہ مؤحد تھے) ۔"

اس لیے یہودیوں اور مسیحیوں کا براہیمی مذہب کا دعویٰ بے بنیاد اور خوش فہمی پر مبنی ہے۔ اس عنوان سے یہودیوں نے عیسائیوں کو بھی دھوکے میں مبتلا کر رکھا ہے کہ ہم بھی مسیح موعود کے منتظر ہیں جب کی مسلمان مسیح کے مخالف (Antichrist) ہیں ، اس لیے تمہیں ہمارا ساتھ دینا چاہیئے ۔جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اور عیسائی دونوں جس مسیح کا انتظار کر رہے ہیں وہ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ ہیں جبکہ یہود جس مسیح کے انتظار میں ہیں ، وہ دجال ہے ، جس کو مسیح موعود قتل کرینگے۔اس لحاظ سے یہود مسلمانوں کی طرح مسیحیوں کے بھی دشمن (Antichrist) ہوئے۔اس لیے موجودہ صورتحال میں عیسائیوں کو مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہئیے نہ کہ یہودیوں کا ، کیونکہ یہ یہودی ہی تھے جو حضرت عیسیٰؑ کو زندگی بھر ستاتے رہے اور انہیں قتل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی ۔بلکہ خود عیسائیوں کے بقول یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو پھانسی دلوائی تھی اور آج بھی یہودی ان کی درپردہ مخالفت میں پیش پیش ہیں، مگر وقتی طور پر ساتھ دینے کا ڈرامہ رچا رہے ہیں جو ان کے قائل ہونے کی دلیل نہیں بلکہ ان کے تعاون سے مفادات کے حصول میں مگن ہیں۔ان نازیبا حرکات ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوئے۔ نتیجتاً ذلت و مسکنت ان پر مسلط کی گئی:﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾[33]

ترجمہ: "چھاپ دی گئی ہے ان (یہود) پر جہاں کہیں بھی یہ پائے جاویں مگر ہاں ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ایسے ذریعہ کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہے، اور مسلط ہوا ان پر اللہ کا غضب اور ان پر غربت کی مہر لگا دی گئی کیونکہ یہ اللہ کی آیات کو جھٹلاتے تھے اور انبیاء بے حق کو قتل کر دیتے تھے، یہ سب ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا نتیجہ ہے"

اس کے بعد سے نہ تو پھر کبھی انہیں عروج نصیب ہو اور نا ہی مستقل حکومت قائم کر سکے اور تا قیامت ان کی یہی حالت رہے گی۔ مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے دجال کی حمایت کریں گے۔ اسی دوران مسیح موعود کا نزول ہو گا جو دجال کو قتل کر دیں گے اور یہود کی سرکوبی کریں گے۔

حیرت اس بات پر ہے کہ مقدس یروشلم کی دعویدار اسرائیلی اولاد کسی بھی زمانے میں نہ تو مقدس یروشلم کا تحفظ کر سکی اور نہ ہی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکی۔ 586 ق م بخت نصر کے حملے سے لیکر 638ء کے اسلامی فتوحات کے آغاز تک یہودی یروشلم میں محکوم ہی رہے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مقدس یروشلم پر حملہ آوروں کو بھگانے کے لیے کبھی خدائی قوتیں متحرک نہیں ہوئیں جب کہ خانہ کعبہ حملہ کرنے والے ابرہا کو خدائی قوتوں نے پسپا کیا تھا۔ مشیت خداوندی اس بات کو نوٹ کر رہی تھی کہ اگر اسرائیلی اولاد مقدس یروشلم کا تحفظ نہیں کر سکتی اور یروشلم ان سے بار بار چھینا جاتا ہے اور وہ غلامی کی زنجیریں پہنتے ہیں یا بابل کی طرف ہجرت (Diaspora) کرتے ہیں تو کیوں نہ مقدس یروشلم کو محفوظ بنانے کے لیے اولاد اسماعیلؑ کے قبضہ میں دیا جائے جو اس کی دینی حیثیت کو اسی طرح بحال رکھیں جس طرح حضرت محمد ﷺ نے خانہ کعبہ سے بتوں کو توڑ کر اس کی دینیاتی حیثیت کو بحال کیا یوں ساتویں صدی عیسوی کے اوائل میں مقدس یروشلم کو اللہ تعالیٰ نے اولاد اسماعیلؑ کے قبضہ میں دے دیا۔ اسی مقصد کے لیے اسلام نے اسراء کی رات نبی کریم ﷺ کو مسجد حرام سے روانہ کر کے مسجد اقصیٰ پہنچا دیا جہاں سے آپ ﷺ نے اپنے تاریخی بالائی سفر کا آغاز کیا تھا۔ پھر مدینہ منورہ میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروکاروں (صحابہ کرامؓ) نے سولہ مہینے تک یروشلم ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی تا کہ آئندہ کا مؤرخ یہ نہ کہہ سکے کہ اسلام ایک ایسے مقام کو آخری اسلامی خلافت کا مرکز قرار دے رہا ہے جو بت پرست رومیوں کے تسلط کے بعد تثلیثی مسیحیوں اور زیر عتاب یہودیوں کا شہر رہا ہے۔ اور کسی بھی زمانے میں اس کی دینیاتی تطہیر نہیں کی گئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد حضرت عمرؓ نے عبادات کے ذریعے یروشلم کے حوالے سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کے اس قرب نسبتی کے اطلاقی تعبیر کو ممکن بنایا۔ مقدس یروشلم کے حوالے سے یہ تاریخی تجربہ ہر محقق اور ہر مؤرخ

کے سامنے ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں جب یورپ کے صلیبیوں نے مقدس یروشلم پر حملہ آور ہوئے تو اولادِ اسماعیلؑ نے پانچ صلیبی جنگوں میں عیسائی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کر کے مقدس یروشلم پر اسلام کا جھنڈا لہرایا جس کا تجربہ یہودیت کی تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہو سکا۔ اکثر بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنی وراثت کا تحفظ نہ کر سکے تو اس کے چچازاد بھائیوں کے لیے اپنے دادا کی میراث کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے اسے اپنے قبضے میں لینا جائز ہے۔ مقدس یروشلم پر اسلامی فوجوں کا قبضہ اسی تاریخی اتار چڑھاؤ کا حصہ ہے۔ قرآن مجید میں بھی اس عظیم عمارت کی تعمیر کے بارے میں ذکر موجود ہے کہ اس کی محرابوں کی تعمیر میں حضرت سلیمانؑ نے جنات سے مدد لی تھی جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت سلیمانؑ کے لیے مسخر تھے۔ اہل کتاب کے بعض سنجیدہ علماء ہیکل سلیمانی کے پر شکوہ عمارت کے بارے میں کتاب مقدس میں مذکور تفصیلات کو مبالغہ آمیزی گردانتے ہیں۔[34]

خلاصہ

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تینوں سامی مذاہب میں واحد اسلام اپنی اصلی حالت پر موجود ہے کیونکہ ایک تو اس دین کی آسمانی کتاب پر ساڑھے چودہ سو سال کا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود تاحال ایک حرف کی کمی بیشی کوئی نہ کر سکا۔ اس کے برعکس کتاب مقدس کے بارے میں خود انہیں بھی قطعی طور پر معلوم نہیں کہ کب اور کس کی لکھی ہوئی ہے۔ رہی یہ بات کہ بائبل اور قرآن دونوں میں ان کی واپسی کا ذکر موجود ہے یہ ان کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں۔ کیونکہ وہ جس طریقہ سے یروشلم پر اس وقت اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ طریقہ کسی بھی آریائی اور غیر سامی دین میں ممکن نہیں چہ جائیکہ ایک سامی مذہب اس قسم کی بربریت کی اجازت دے، جو وہ آج کل وہاں بپا کئے ہوئے ہیں۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ یروشلم کی پوری تاریخ اگر سامنے رکھ کر دیکھی جائی تو ازخود معلوم ہو جائے گا کہ کس نے وہاں کتنا عرصہ حکومت کی۔ اس نے کیا کیا کس عہد میں یہاں کے لوگوں نے خوشحال زندگی بسر کرتے رہے۔ بخت نصر کے حملہ تک چار سو سال یہودیوں کا دور حکومت ہے جس میں انہوں نے خدا کی نافرمانی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جس پر قرآن گواہ ہے۔ پھر بابلی، رومی اور ایرانی ادوار کے بعد مسیحیت کا دور چوتھی صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ ساتویں صدی عیسویں تک یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں رہا سوائے پون صدی کے کہ مسیحی یہاں قابض رہے۔ جس سے شاید قدرت خداوندی کو یہ ظاہر کرانا مقصود تھا کہ اہل کتاب اور مسلمانوں میں سے کون اس شہر کے تقدس کو صحیح معنوں میں "جاننے والا، عزت کرنے والا اور اس کی ملکیت کا اہل ہے۔ پس سامی مذاہب میں ہر ایک فریق یعنی یہودی،

مسیحی اور مسلمان اس شہر کے استحقاق کا دعوی اور دلائل رکھتا ہے۔ دلائل کی حیثیت اور عدد کے کسر کے علاوہ پانچ صدیوں تک یہودیوں نے، چار صدیوں تک مسیحیوں نے اور بارہ صدیوں تک مسلمانوں نے یہاں پر حکومت کی۔ ایک محقق کو یہ فیصلہ کرنے میں ذرابرابر جھجھک محسوس نہ ہو گا کہ یہودی اور عیسائی ادوار پر مشتمل تقریباً نو صدیاں ظلم اور جبر پر محیط ہیں ۔ حق اور سچ بات یہ ہے کہ خود اہل کتاب اور دوسرے مذاہب کے لوگ یہاں جینے سے بیزار نظر آتے تھے اور ہیں۔ اور دوسری طرف مسلمانوں کا دور جو بارہ صدیوں کے طویل دورانیے پر مشتمل ہے میں کوئی شکوہ نہیں پایا جاتا۔ اس دور میں مسلمانوں کی طرف سے زیادتی تو درکنار کسی اور کو کرنے بھی نہیں دی۔ تو ایسے میں اہل یروشلم کیوں نہ مسلمانوں کو چاہتے۔ صرف مسیحیوں کے نوے سالہ دور حکومت اور یہودیوں کا حالیہ ستر سالہ دور سلطنت اور مسلمانوں کا چار صدیوں پر محیط عثمانی دور کے موازنے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اور یہ بھی غور طلب بات ہے کہ مسیحیوں یا یہودیوں نے اس شہر پر قبضہ جمانے کے لیے بربریت اور انسانیت سوز طریقے کا انتخاب کر کے اس مقدس شہر کے تقدس کو پائے مال کیا ۔اور مسلمانوں نے مصلحانہ اور عادلانہ طریقہ اپنا کر اس کی عزت کی لاج رکھی اس پر تاریخ گواہ ہے۔ اب اس کے استحقاق کا حق مسلمانوں کا ہے جنہوں نے اس کی عزت کی لاج رکھی ہے یا ان کا جنہوں نے اس کے تقدّس کا پائے مال کیا۔

References

[1]Kitāb Muqadds Peydā'ish,:12-13

[2] Banī'Isrāīl:40

[3] Al Baqara:79

[4] Banī'Isrāīl:104

[6] Banī'Isrāīl:7

[6]Abū 'IisāBin Sawra Tirmdhī,Sunan Tirmadhī,Ḥadīth:106-107

[7]Paul Findely, **They Dare to Speak Out: People and Institutions confront Israel Lobby,** (Lawrence Hill Books, N.D). p.245

[8] Al mā'Ida:21

[9] Al Baqara:133

[10] Ibid

[11] Al mā'Ida:21

[12] Al Ambiyā:105
[13] Al Baqara:124
[14] Ibid:51
[15] Al Baqara:165
[16]Ibid:59
[17]Ibid:57
[18] Ibid:
[19] Al Nisā:160
[20] Al mā'ida:78
[21] Al Baqara:61
[22] Banī'Isrāīl:5
[23] Aāl 'Imran:67
[24] Al Baqara:133
[25] Ibid:135
[26] Aāl 'Imran:65
[27]yes'iīyah,2:2-5
[28] Ibid11:9-1
[29] Ibid11:10-16,14:1-2
[30]Ibid:20-66
[31]Paul Findely, They Dare to Speak Out: People and Institutions confront Israel Lobby, (Lawrence Hill Books, N.D). p.245
[32]Aāl 'Imran:67
[33]Aāl 'Imran:112
[34]For detail visit Temple of Solomon www.jewishencyclopedia.com